نزول احکام میں تدریج اور انسانی مصلحتوں کا لحاظ

حافظ محمد سعید احمد عاطف*

حافظ طارق محمود**

تدریج اور ارتقاء خاصۂ تخلیق ہیں۔ ہر چیز میں قرینہ اور مرحلہ بہ مرحلہ اسکی نشو ونما تقاضائے فطرت ہے۔ یہ اندازِ مظہرِ جمال ہے اور حسنِ تخلیق کی انتہا، اگر چہ خالقِ کائنات کا امر ''کن'' بھی اس کائنات میں کام کر رہا ہے لیکن کئی جگہ پر ربِّ حکیم وعلیم نے تدریج کا انداز اختیار فرمایا ہے، ایک طرف ''کن'' اگر اسکی شانِ قدرت اور کائنات پر اسکی جبّاری کا بین ثبوت ہے۔ تو دوسری جانب تدریج کا اصول اسکی بے کراں حکمت پر دلالت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز پر قدرت تامہ کے باوجود اس کائنات کو یکبارگی کی بجائے چھ ایام یا چھ ادوار میں تخلیق فرمایا۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ﴾(۱)

ان چھ ایام سے مراد چھ ادوار اور مراحل ہیں اور یہ کسی شے کے از حد درجہ اہتمام کی علامت ہے۔

اسی طرح اگر اشیاء کائنات میں غور کیا جائے تو اکثر جگہ اللہ تعالیٰ کی ''سنت تدریج'' کارفرما نظر آتی ہے۔ تمام تر زراعت، پھلوں، پھولوں میں اس ذات باری کی ''تدریجی حکمت'' ہی دکھائی دیتی ہے۔ بیج کی کاشت سے قبل کھیت کو درست کرنا، مخصوص موسم کا انتظار کرنا، پھر بیج کی بارآوری تک اس کی حفاظت اور دیگر تمام لوازمات کا بہم پہنچانا اور مختلف بیماریوں سے بچاؤ کی تدبیر وغیرہ کرنا اس تمام تر ''تدریجی عمل'' کی تکمیل کے بعد ہی انسان اس کھیتی سے متمتع ہوتا ہے۔

ایسے ہی اگر خلاصہ کائنات-انسان-خود اپنے وجود پر غور کرے جس کی اسے ''بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ''(۲) کہہ کر تلقین کی گئی ہے۔ تب اسے اپنے وجود کی تخلیق میں بھی ''قانونِ تدریج'' کارفرما نظر آئے گا۔ ارشاد ہے:

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِیْنٍ، ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِیْ قَرَارٍ مَّكِیْنٍ، ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ﴾ (۳)

دیگر مقامات پر بھی قرآن پاک نے اس موضوع پر مختلف حوالوں سے روشنی ڈالی ہے۔(۴)

خلاصتاً قرآن کریم نے انسانی جنین کے مراتب خمسہ بیان کئے ہیں:

۱-نطفہ ۲-علقہ ۳-مضغہ ۴-ہڈیاں بنانا ۵-ہڈیوں پر گوشت چڑھانا

---

*اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ علوم اسلامیہ، گورنمنٹ ایم اے او کالج، لاہور، پاکستان۔

**اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ علوم اسلامیہ، گورنمنٹ کالج، جھنگ، پاکستان۔

ان میں جس قدر ''فطری تدریج'' ہے وہ ظاہر ہے پھر معاملہ یہیں ختم نہیں ہوتا بلکہ جس طرح بطن مادر میں رہ کر انسان نے مدارج تخلیق طے کئے ہیں باہر زمین پر آ کر بھی اسے تدریجاً کچھ منازل طے کرنی پڑتی ہیں۔

۱-بچپن ۲-جوانی ۳-بڑھاپا ۴-نکمی عمر

اس اعتبار سے انسان کو اپنی زندگی میں کم وبیش نو ادوار سے گزرنا پڑتا ہے۔ پانچ بطن مادر میں اور چار دنیا میں آنے کے بعد وجہ ارض پر۔(۵)

اس خلاق اعظم نے اس کائنات کو بنانے میں اور انسان کو وجود دینے میں جس طرح تدریج سے کام لیا اسی طرح نزول احکام میں بھی انسانی مصلحتوں کا لحاظ رکھتے ہوئے اس ذات کریم نے ایک گونہ تدریج رکھ دی ہے تاکہ انسان فطری طریقہ کے مطابق ان احکام الٰہیہ کی تعمیل کر سکے، کیونکہ یکبارگی کی صورت میں احکام کی بجا آوری بسا اوقات انسان کے بس میں نہیں ہوا کرتی کیونکہ یہ انداز وطریقہ اس کی فطرت سے مطابقت نہیں رکھتا اور دینِ متین بھی عقائد اور چند مستثنیات کے علاوہ تدریجی انداز کا حامل ہے۔

اور انسانی مصالح اور معاشرہ کے عرف کو نظر انداز کر کے کوئی حکم کرنا، حکمتِ الٰہیہ کے خلاف ہے۔ اب نزول احکام کی مصلحتوں اور تدریج سے صرف نظر کر کے کسی معاشرے میں بیک وقت دین کے تمام کلّیات وجزئیات کو نافذ کرنا، گویا لوگوں کو دین کے ثمرات سے محروم کرنا ہے اور اس نہج پر ''نفاذِ شریعت'' سے متعدد مسائل (problems) پیدا ہو سکتے ہیں اور قانون شریعت (جو اصلاً قانون فطرت ہی ہے) سے بنی آدم میں توحُش وبُعد پیدا ہو سکتا ہے اور یہ اندازِ دین سے قرب کی بجائے دوری کا سبب بن سکتا ہے۔

بایں اسباب ان حِکم ومصالح کا لحاظ اور اس سے متعلق امور کو فقہ اسلامی میں ''تدریج'' سے موسوم کیا گیا ہے۔(۶) جس میں انسانی احوال ومصالح کا خیال کرتے ہوئے احکام شرعیہ کی تنفیذ کے طریقہ کار کی جانب رہنمائی کی گئی ہے تاکہ تمام لوگوں کیلئے دین پر عمل کرنا آسان ہو جائے۔ اس کی حکمتیں اور فوائد عامۃ الناس کے سامنے آ جائیں اور لوگ ان سے مستفید بھی ہو سکیں اور انسانی معاشرے کے اندر دین کا نفوذ ہو اور انسانی شخصیت پر اسکے عملی اثرات مرتب ہوتے دکھائی دیں۔

لغوی مفہوم:

اس تناظر میں اس لفظ ''تدریج'' کے لغوی معنی پر ایک نظر ڈالتے ہیں:

تدریج باب تفعیل سے مصدر ہے۔ مادہ د۔ر۔ج ہے۔ جس کے معنی آہستہ آہستہ چلنا ہے۔ تدریج کا ایک معنی سیڑھی بنانا بھی ہے۔(۷) لسان العرب میں ہے: ''درج أی أدناه علی التدریج، فتدرج هو'' اسی مفہوم میں یہ آیت ہے:

﴿سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ اسی تناظر میں حضرت عمرؓ کا یہ قول اس کی وضاحت کرتا ہے۔ آپ کے پاس جب کسریٰ

کے خزانے کے لدے ہوئے اونٹ آئے تو آپؐ نے فرمایا:

"اللّٰھم انی اعوذبك ان اکون مستدرجًا" (۸)

''اے اللہ میں اس سے پناہ مانگتا ہوں کہ آپ مجھے آہستہ آہستہ جکڑ لیں۔''

امام راغب نے ''مفردات'' میں بتایا ہے کہ محاورۂ عرب ہے:

"فلان بتدریج فی کذاو درج الشیخ و الصبی درجانا" (۹)

''یعنی فلاں اس پر درجہ بدرجہ چڑھ رہا ہے اور بوڑھے و بچے کا اس طرح آہستہ آہستہ چلنا، جیسا کہ سیڑھی پر چڑھنے والا چڑھتا ہے۔''

''الوسیط'' میں ہے علیل کو دوا دے کر آہستہ آہستہ صحت تک پہنچا دینا ''تدریج'' کہلاتا ہے۔(۱۰)

اصطلاحی مفہوم:

کسی بھی شے کو قرینہ، سلیقہ اور اس کے مطلوب تقاضے کے مطابق سرانجام دینے میں اصلاً تدریج کا مفہوم مستتر ہوتا ہے۔''آہستہ آہستہ اور درجہ بدرجہ کسی چیز کو (اس کے احوال کے مطابق) انتہاء اور کمال تک پہنچا دینا''۔اور کسی امر شرعی کی تنفیذ کے وقت اس کے عرف و عادات اور مصلحتوں کا لحاظ رکھنا۔(۱۱)

خلاصہ یہ کہ تدریج میں ایک خاص مطلوب رفتار، ترقی اور ارتقاء کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔یعنی کسی شے کو درجہ بدرجہ اس طرح حد کمال تک پہنچا دینا کہ اس میں کوئی کمی و نقص نہ رہے۔اس کے تمام افادی پہلو واضح ہو کر سامنے آجائیں۔طبع سلیم کے لئے اس پر عمل کرنا آسان ہو اور اس کی بدولت تہذیبِ نفس و تطہیرِ اعمال کر کے انسان فلاحِ دارین حاصل کر سکے۔

''یکبارگی'' کے مقابل یہ طریقہ فطرت کے قریب تر ہے کیونکہ انسان یکدم تمام اعمال پر محافظت و مداومت نہیں کر سکتا۔

یہ ''تدریجی عمل'' فطرت انسانی کا اقتضاء ہے کیونکہ انسانی ذہن بھی ایک کھیت کی طرح ہے، اس کی زمین کو بھی تیار کر کے ہی اس میں تخم کاشت کیا جانا چاہئے۔اس کے لیے اسے ہموار کرنا، بیج کا صحتمند ہونا، اس مخصوص موسم کا ہونا اور پھر ''موانعات'' کے ضمن میں اس کی ہر طرح کی فاسد بوٹیوں اور جھاڑ جھنکار سے حفاظت بھی کرنا۔اسی طرح جب تک تعلیم و تربیت کے ذریعے اذہان و قلوب کو کسی عمل کیلئے تدریجاً تیار نہ کیا جائے تب تک عمدہ سے عمدہ قانون بھی مؤثر نہیں ہوا کرتا اور یہ فکری و عملی تیاری حقیقتاً عمل تدریج ہی کی صورت میں ممکن ہے۔فقہ اسلامی میں اس تدریج کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے اور تدریج کو انسانی مصلحتوں کے تناظر میں دیکھا ہے تاکہ اس کی بدولت مقاصد شریعت کا حصول ممکن ہو سکے۔

نزول احکام اور تدریج:

۱- نزول قرآن میں تدریج:

شریعت اسلامیہ کا ماخذِ اول قرآن کریم ہے، اس میں وہ تمام اصول وکلیات بیان کر دیئے گئے ہیں کہ جن پر شریعت اسلامیہ کی بنیاد استوار ہوئی اور ایک اسلامی معاشرہ وجود میں آیا پھر اسکی وسعت، اجتماعی صورت میں ایک ریاست کی شکل میں ظہور پذیر ہوئی۔ اس عرصے میں نزول احکام کا انداز، انسانی مصلحتوں اور تدریج کا حامل رہا اور قرآن کریم کا نزول بھی تدریجاً ہوا ہے۔ یہ مدت تقریباً ۲۳ برس بنتی ہے۔ اس تدریجی نزول پر کفار نے اعتراض بھی کیا:

﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ لَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً كَذٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا﴾ (۱۲)

مکی دور: اس میں ابتدائی مرحلہ میں کچھ کچھ عبادات بھی جاری رہیں لیکن ان کی تکمیل مدنی دور میں ہوئی البتہ اس مکی دور میں زور پختگی عقائد اور مکارم اخلاق پر دیا گیا۔ جب یہ عقائدِ اسلامیہ اور عبادات کے ساتھ ساتھ صفاتِ حسنہ اور اعلیٰ اخلاق دل میں اچھی طرح بیٹھ گئے اور مشرکین کے شدائد ومصائب کے باوجود بھی حرارت ایمانی سرد نہ ہوسکی اور سیرت وکردار میں مطلوب پختگی پیدا ہوگئی تو مرحلہ ثانی (مدنی دور) شروع ہوا۔ اب یہاں اعمال وفرائض دینیہ اور معاملات وعبادات کی تکمیل ہوئی اور عائلی زندگی سے لے کر نظم ریاست تک کے احکام نازل ہوئے اور یوں یہ دین تدریجاً مکمل ہوگیا ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ﴾ (۱۳)

۲- فریضہ صلوٰۃ میں تدریج:

نماز اسلام کا بنیادی رکن ہے۔ شرائع سابقہ میں بھی نماز کی عبادت دائمًا رہی ہے گو اس کی ہیئت وصورت میں تبدیلیاں آتی رہی ہیں لیکن قیام، رکوع اور سجود کی ظاہری صورت ہمیشہ موجود رہی اور اس عبادت کو شروع ہی سے توجہ الی اللہ کا ذریعہ بنایا گیا۔ قرآن پاک میں بھی اس کے متعدد شواہد موجود ہیں کہ کس طرح ہر قوم میں اسکی اہمیت بنیادی رہی ہے۔ (۱۴)

ڈاکٹر یٰسین مظہر صدیقی اس پر یوں روشنی ڈالتے ہیں: ''نماز کی وہی ہیئت اور ساخت تھی جو آج بھی ہے اور عہد نبوی سے برابر اسی طرح چلی آرہی ہے، یعنی تکبیر تحریمہ، قیام، رکوع، قومہ، سجدے، سجدوں کے درمیان جلسہ، آخری رکعت تشہد کا قعود اور سلام وغیرہ کے تمام ارکان..... یہ صحیح ہے کہ بہت سی تفصیلات اور جزئیات بعد میں طے ہوئیں، نماز کا طریقہ بھی ''تدریجی اصولِ اسلام'' پر مبنی ہے۔'' (۱۵)

یعنی حضور اکرم ﷺ اور صحابہ کرامؓ ابتدائے اسلام ہی سے ادائیگی صلوٰۃ پر عمل پیرا تھے لیکن نماز کی موجودہ ہیئت وصورت کئی مراحل سے گزرنے کے بعد پایہ تکمیل کو پہنچی اولاً دورانِ نماز کئی گنجائشیں تھیں جو بتدریج کم ہوتی اور سمٹتی چلی گئیں۔

ام المؤمنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں:

"فرض الصلوة حين فرضها ركعتين ركعتين فى الحضرو السفر و زيد فى صلوة الحضر" (۱۶)

عن ابن مسعودؓ قال كنا نسلم على رسول الله ﷺ فيرد علينا حتى قد منا عن ارض الحبشة سلماً عليه فلم يرد علينا فقال! ان لا يتكلم فى الصلوة (۱۷)

ایک اور حدیث اس مسئلے کی ''تدریجی حیثیت'' کو اچھی طرح واضح کر دیتی ہے:

"عن زيد بن أرقمؓ قال كنا نتكلم خلف رسول الله صلى الله عليه وسلم حتىٰ نزلت وقوموا لله قانتين، فأمرنا بالسكوت و نهينا عن الكلام" (۱۸)

اسی ضمن میں حضرت جابر فرماتے ہیں کہ نبی مکرم ﷺ نے مجھے نماز میں کسی بھی قسم کی بات چیت کرنے سے منع فرمایا یعنی اب نماز میں ہر قسم کا کلام بند ہو گیا اور حرکات خاص حد تک محدود ہو گئیں۔(۱۹) انہی احادیث کی بنیاد پر ملا علی قاری فرماتے ہیں:

''اسلام میں ابتداً نماز کے اندر کلام کرنا جائز تھا، بعد میں اس سے منع کر دیا گیا اور ایک خاص حکمت و تناسب کے ساتھ ساتھ یہ عبادتِ دینی موجودہ ہیئت تک پہنچی۔''(۲۰)

فرضیت نماز کے اس تدریجی پس منظر کی وضاحت یٰسین مظہر صدیقی اسطرح کرتے ہیں:

''تدریجی قانونِ ارتقاء کا تقاضا تھا کہ پہلے ایک، پھر دو نمازیں فرض ہوں اور جب امت کی طبائع عادی ہو جائیں تو رات دن کی کامل نمازوں کا حکم آئے جیسا کہ معراج کے بعد آیا اور ساتویں حکمت الٰہی کا یہی تقاضا تھا۔ علماء محدثین اور پوری امت اسلامی کا اجماع ہے کہ پانچ نمازوں- فجر، ظہر، عصر، مغرب، عشاء- کی فرضیت اسراء و معراج کے واقعہ کے دوران ہوئی اور آسمان پر اللہ تعالیٰ نے براہِ راست رسولِ اکرم ﷺ کو ان پانچ نمازوں کے پڑھنے کا حکم دیا۔ وہ شروع میں پچاس نمازیں تھیں مگر درخواست نبوی پر پانچ کو پچاس کے برابر کر دیا گیا۔

"ففرض الله على امتى خمسين صلاة.....فقال: هى خمس وهى خمسون....."

اور حکمت الٰہی یہی تھی کہ اسلام کے عظیم ترین رکن کا حکم براہ راست زبانِ الٰہی سے رسول اکرم ﷺ کو بلا کر دیا جائے۔(۲۱)

معلوم ہوا کہ نماز جیسی بنیادی عبادت بھی موجود انداز میں مکمل طور پر نازل نہیں ہوئی بلکہ مختلف تدریجی مراحل طے کر کے موجودہ صورت تک پہنچی ہے۔ اور اسے حرکت سے سکون کی طرف تدریجاً لایا گیا ہے۔

۳- فرضیت صوم میں تدریج:

روزہ اور تزکیہ نفوس کا باہم گہرا ربط ہے۔ خواہشات نفسانیہ کو زیر و پابند شرع کرنے میں روزہ از حد معاون عبادت

ہے۔﴿كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ سے مترشح ہوتا ہے کہ ہر نبی کی تعلیمات میں روزے شامل رہے ہیں۔گو ان کے انداز واوقات مختلف رہے۔اس عبارت کی خاص تربیتی اہمیت ہے۔

معارف القرآن میں ہے:

''قرآن کریم کے الفاظ''اَلَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ'' عام ہیں۔حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک کی تمام شریعتوں اور امتوں کو شامل ہیں۔اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح نماز کی عبادت سے کوئی شریعت اور کوئی امت خالی نہیں رہی اسی طرح روزہ بھی ہر شریعت میں فرض رہا ہے۔''(۲۲)

تزکیہ نفس میں حد درجہ معاون، روزہ جیسی عظیم الشان عبادت بھی یکبارگی میں فرض نہیں ہوئی بلکہ رب کریم نے یہاں بھی ''تدریج'' کی حکمت اختیار کی اور روزوں کو متعدد مراحل میں فرض کیا۔

تفسیر ابن کثیر میں روزہ کی ارتقائی منازل کا ذکر ہے:

''ان کے مطابق نماز اور روزہ دونوں تین تین مراحل ارتقاء سے گزرے۔روزے کے ضمن میں تین احوال نبوی ﷺ یہ تھے: اول اول آپ نے ہر ماہ تین دنوں کے روزے رکھے، دوسرے مرحلے میں آپ نے عاشورہ کے روزے رکھے۔تیسرے مرحلے میں آپ نے رمضان کے روزے رکھے۔(۲۳) اس کے علاوہ ذخیرہ روایات پر نظر ڈالی جائے تو دیگر روایات کی تفصیلات سے روزوں کی فرضیت کے یہ چار مراحل نظر آتے ہیں۔''

مرحلہ اولیٰ:

مسلمان ابتداً یوم عاشورہ کا روزہ رکھتے تھے۔مسلم شریف کی روایت ہے کہ:

"عن ابن عباسؓ ان رسول اللّٰہ ﷺ قدم المدینة فوجد الیهود صیاما یوم عاشور آء فقال لهم رسول اللّٰہ ﷺ ما هذا الیوم الذی تصومونة فقالوا بهذا الیوم عظیم انجی اللّٰہ فی موسیٰ و قومه و غرق فرعون و قومه فصامه موسیٰ شکرا، فنحن نصومه، فقال رسول اللّٰہ ﷺ! افنحن أحق و اولی بموسیٰ منکم فصامه رسول اللّٰہ ﷺ وامر بصیامه "(۲۴)

مسند احمد میں یہی بات کچھ اضافے سے مذکور ہے کہ:

''رسول اللہ جب مدینہ تشریف لائے تو ہر ماہ تین روزے اور ایک روزہ یوم عاشورہ کا رکھا کرتے تھے۔سترہ ماہ آپ ﷺ نے اسی طرح روزے رکھے۔''(۲۵)

یعنی یہ سلسلہ بتدریج آگے بڑھتا رہا۔

مرحلہ ثانیہ:

جب آیت ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾

نازل ہوئی تو ماہ رمضان کے روزے فرض قرار پائے لیکن ساتھ ہی فدیے کی رعایت عطا کر دی گئی اور عاشورہ کا روزہ بھی اختیاری کر دیا گیا۔

"عن عائشه رضی اللّٰه عنها ان یوم عاشورآء کان یصام فی الجاهلیة فلما جآء الاسلام من شاء صامه ومن شآء ترکه" (۲۷)

''عہد جاہلیت میں یوم عاشورہ کا روزہ رکھا جاتا تھا جب اسلام آیا تو یہ روزہ اختیاری ہو گیا جو چاہے رکھے اور جو چاہے نہ رکھے۔''

یعنی ''اسلام آیا'' سے مراد جب اسلام میں روزوں کا حکم دیا تو پھر یوم عاشورہ کا روزہ اختیار ہو گیا، لازمی نہ رہا۔

یہ ہجرت کا دوسرا برس تھا آزمائشیں حد سے سوا تھیں۔ عسرت وشدائد کا زمانہ تھا، اس لئے ایک ماہ کے روزوں کو لازمی فرض نہ قرار دیا گیا۔ اس سے مقصود یہ تھا کہ اگر کوئی شخص روزہ نہ رکھنا چاہے تو اسے آزادی تھی کہ وہ چاہے تو روزہ رکھے اور چاہے تو بطور فدیہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دے۔ یہ اللہ کی طرف سے ایک خاص آسانی تھی جو اس دور کے ساتھ مخصوص تھی۔

مرحلہ ثالثہ:

اب یہاں مومنین کے اذہان میں اس فریضہ کی اہمیت راسخ ہو چکی تھی اور ان کے اجسام بھی اس مشقت کو برداشت کرنے کی بتدریج اہلیت حاصل کر چکے تھے اس لیے اس مرحلے میں لوگوں کو اس امر کی ترغیب دی گئی کہ وہ اس رعایت یعنی فدیہ سے فائدہ اٹھانے کی بجائے مشقت برداشت کرنے کی کوشش کریں اور اگر مریض اور مسافر نہ ہوں تو روزے ہی رکھیں۔ اس لئے حکم آیا:

﴿وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ (۲۸)

مرحلہ رابعہ:

اس تدریج کے سبب اب لوگوں کی طبائع مشقت صوم کی اہل ہو چکی تھیں اس لئے فدیہ والی رعایت واپس لے کر ہر اس شخص پر روزہ فرض قرار دے دیا گیا جو نہ تو بیمار و مسافر ہے اور نہ شیخ فانی۔ اس لئے قطعی حکم آ گیا۔ ﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾ ا الیعنی اب ہر وہ شخص جو عاقل، بالغ، مقیم اور صحت مند ہو اس پر رمضان کے روزے فرض ہیں۔ البتہ مریضوں، مسافروں اور نفاس وحیض والی خواتین کو اجازت ہے کہ وہ روزوں کی یہ مدت بعد میں پوری کر لیں۔ اس طرح تین مراحل میں تدریجاً فرضیت صوم کی تکمیل ہوئی۔

مولانا یٰسین مظہر صدیقی اس ساری تفصیل کو اس طرح سے سمیٹتے ہیں:

''تین روزے اور عاشورہ کے روزے رکھنے کا سلسلہ مکہ مکرمہ سے شروع ہو چکا تھا اور غالباً یہ تینوں مراحل مکی اسلام کے علاوہ دین حنیفی میں بھی تھے اور دوسرے شرائع میں بھی لیکن ان میں سے رمضان کے روزوں کو فراموش

کر دیا گیا تھا لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ان تینوں مراحل کے ذریعے روزہ رکھنے کی عادت ڈلوائی۔ جس طرح نماز میں ایک وقت سے دو وقت اور دو وقت سے پانچ وقت کا ارتقاء ہوا اسی طرح روزہ کے باب میں ایک دن کے روزے سے تین دن کے روزے اور تین دنوں سے تیس دنوں کا ارتقاء ہوا۔ یہ خالص تدریجی اصولِ فرضیت کا معاملہ ہے جو تمام فرائض اسلامی میں کارفرما نظر آتا ہے۔'' (۲۹)

یعنی اللہ کی حکمتِ بالغہ کا یہ تقاضا رہا ہے کہ انسانوں کو کوئی حکم دینے سے قبل اس کا تحمل پیدا کیا جائے تاکہ انسان ان عبادات واحکامات کے ساتھ مانوس ہو جائے، اسی کا نام تدریج ہے۔

۴۔فریضہ زکوٰۃ کی تدریجی تکمیل:

زکوٰۃ مالی عبادات میں اہم ترین عبادت ہے لیکن اس کے احکام بھی یکبارگی عمل میں نہیں آئے بلکہ تدریج کے متعدد مراحل طے کر کے زکوٰۃ کا پورا نظام فتح مکہ کے بعد قائم ہوا۔ شروع میں زکوٰۃ کا لفظ انفاق وخیرات کا ہم معنی تھا اور اس انفاق و خیرات پر مسلمانوں کو مختلف پہلوؤں سے ابھارا گیا۔

کبھی ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ (۳۰) کی آیت آئی اور کہیں ﴿وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ (۳۱) کے پہلو سے ترغیب دلائی اور کہیں انفاق پر اجر کبیر کا وعدہ فرمایا اور کسی مقام پر ﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ﴾ (۳۲) کا جواب ''العفو'' کہہ کر دیا۔

اسی طرح آنحضرت ﷺ نے عورتوں کی نفسیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ارشاد فرمایا:

"لاتوعی فیوعی اللّٰہ علیك ارضحی ما استطعت" (۳۳)

''روپیہ پیسہ تھیلی میں بند کر کے نہ رکھو اللہ تعالیٰ بھی تمہیں عطا کرنا بند کر دے گا۔ اے طبقہ اناث جہاں ہو سکے خیرات کرتی رہو۔''

مرحلہ اولیٰ:

اس وقت کے اہلِ ایمان کی تربیت کے لیے یہ مناسب تھا کہ ان کی انفاق فی سبیل اللہ کا جذبہ بیدار کرنے کے لیے اسی انداز کی تربیت ہوتا کہ مال کی محبت میں کمی آئے اور انفاق کا جزبۂ خیر فزوں تر ہوتا چلا جائے۔ عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں:

''باقاعدہ احکام زکوٰۃ نازل ہونے سے قبل مسلمانوں کو حکم تھا کہ جو کچھ ضروریات سے بچے اسے راہ خدا میں خیرات کر دیں۔'' (۳۴)

تو گویا یہ حکم اسی آیت کی ''معاشرتی توضیح'' ہے۔ تاکہ اسلامی معاشرے میں یہ سوچ عام کی جائے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والا معاشرہ ہی اصل میں ایک صالح اور تعاون وتناصر والا معاشرہ ہے۔

اس کی مزید وضاحت مسند احمد کی اس روایت سے ہوتی ہے کہ جب بعثت کے پانچویں برس حضرت جعفر بن طیارؓ چند مسلمانوں کے ہمراہ ہجرت کر کے حبشہ پہنچے تو شاہ حبش نجاشی نے انہیں اپنے دربار میں بلا کر ان سے اسلام کی تعلیمات دریافت کیں۔اس کے جواب میں حضرت جعفر نے جو تقریر کی اس میں یہ بھی فرمایا کہ

''وہ پیغمبر ہم کو سکھاتا ہے کہ ہم نماز پڑھیں، روزے رکھیں اور زکوٰۃ دیں۔''(۳۵)

اس سے مترشح ہوتا ہے کہ زکوٰۃ و خیرات تب ہم معنی لفظ تھے اور اس کی ابتدا آغاز اسلام ہی سے ہو چکی تھی۔(۳۶)

مولانا یٰسین مظہر صدیقی لکھتے ہیں:

''مکی اسلام اور مکی احکام دین میں زکوٰۃ بطور فرض موجود تھی اور اس پر مکی مسلمانوں کا پورا عمل بھی رہا تھا۔مکی زکوٰۃ میں اصل بات یہ ہے کہ نصاب اور اقسام و مقادیر مقرر نہ تھیں کہ کتنے مال پر کتنی زکوٰۃ اور کس کس مال پر کتنی کتنی زکوٰۃ عائد ہوتی ہے اور کب عائد ہوتی ہے اور مسلمان صاحبانِ دولت کو اپنی زکوٰۃ کب ادا کرنی چاہئے۔یہ تمام فروعی احکام اور تفصیلی جزئیات بلاشبہ مدینہ منورہ میں نافذ ہوئیں۔''(۳۷)

یعنی انفاق فی سبیل اللہ کا جذبہ وہ بیج تھا جس کے برگ و بار میں زکوٰۃ اور دیگر جملہ مالی عبادات و احکام شامل تھے اور یہ جذبہ بڑی حکمت کے ساتھ تدریجاً بیدار کیا گیا۔

مرحلہ ثانیہ:

جب امت صدقات و خیرات اور انفاق فی سبیل اللہ کی عادی ہوگئی اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا مزاج بنتا چلا گیا تو ۲ھجری میں صدقۃ الفطر کو واجب قرار دے کر زکوٰۃ کی فرضیت کی جانب ایک اور قدم بڑھایا گیا۔تاکہ لوگ اس کی ادائیگی کیلئے ''تدریجاً'' تیار ہو جائیں۔تاہم اسکے ساتھ ساتھ عام صدقات و انفاق پر عمل برابر جاری رہا اور اس عمل پر لفظاً ''زکوٰۃ'' کا اطلاق بھی ہوتا رہا۔

وفد عبدالقیس ۵ھ کو بارگاہ رسالت میں پہنچا۔آپ ﷺ نے ان کو جن احکام کی تعلیم دی ان میں ایک ''زکوٰۃ'' بھی تھی۔(۳۸)

علامہ شبلی نعمانی اس ساری بحث کو یوں سمیٹتے ہیں:

''مدینہ منورہ میں زیادہ تاکیدی آیتیں نازل ہوئیں۔۲ھ میں عید کے دن صدقہ فطر دینا واجب قرار پایا۔ہجرت کے ابتدائی زمانہ میں عام مسلمان اور خصوصاً مہاجرین سخت فقر و فاقہ میں مبتلا تھے، حدیثوں میں صحابہؓ کے فقر و تنگ دستی کے جو واقعات کثرت کے ساتھ مذکور ہیں اسی زمانہ کے ہیں۔اسی بنا پر یہ حکم ہوا کہ جس شخص کے پاس ضروری مصارف سے جو کچھ بچے سب کو خیرات کر دینا چاہئے ورنہ عذاب ہوگا۔چنانچہ خاص آیت نازل

ہوئی۔(۳۹)﴿وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾(۴۰)﴿يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ﴾(۴۱)

مرحلہ ثالثہ:

مسلمانوں کی فتوحات کا دائرہ بتدریج وسیع ہونے لگا۔ اموال وغنائم اور زمینیں مسلمانوں کوملیں اور ساتھ تجارت کی آمدنی بھی شروع ہوگئی تا آنکہ اسلام کی فتوحات کے اس دائرے میں ۸ھ کو مکہ مکرمہ شامل ہوگیا۔ فتح مکہ نے تمام عربوں کوایک وحدت میں پرودیا۔ اب ضرورت تھی کہ دیگر امور کے ساتھ ساتھ دین اسلام اپنا نظام مالیات بھی بکمال وتمام نافذ وجاری کرے اورادھرامت بھی تدریجاً انفاق وخیرات اور صدقۃ الفطر کی عادی ہوچکی تھی۔ اس وقت ۸ھ کو یہ آیت نازل ہوئی:

﴿خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا﴾(۴۲)

''اے نبی! آپ ان کے اموال میں سے صدقہ، زکوۃ لے کرانہیں پاک کردو۔''

اب زکوۃ فرض ہوگئی۔ پھر آئندہ برس ۹ھ کو زکوۃ کے جملہ احکام وقوانین مرتب ہوئے اور اسی سال آنحضرت ﷺ نے سرکاری طور پر محصلین وعاملین زکوۃ کا تقرر فرمایا۔(۴۳)

اس طرح باقاعدہ طور پر زکوۃ، متعدد تدریجی مراحل طے کرتے ہوئے فرض ہوئی۔ اہل عرب کا عمومی مزاج تجارتی تھا اس لیئے ان میں مال سے محبت بہت تھی۔ ایسے معاشرے میں احکام زکوۃ اگر یکبارگی میں نازل کردیئے جاتے تو عین ممکن تھا کہ اس سے متعدد فتنوں کے دروازے کھل جاتے اور عوام الناس ان احکام کو پوری طرح قبول نہ کرتے لیکن شریعت نے کمال حکمت سے انہیں انفاق وخیرات کی جانب راغب کیا تو اس میں انہیں کہیں ﴿وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ﴾ (۴۴) کی ترغیب دی تو کہیں ﴿وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ﴾(۴۵) کی ''وعیدی تبشیر'' دی۔ کبھی جمع مال پر ''وَيْلٌ'' کی وعید سنائی اور پھر زکوۃ کو مالی ٹیکس کے بجائے ''عبادت'' قرار دے کر ان لوگوں کے قلوب و اذھان میں اس فریضہ کی اہمیت راسخ کردی۔ اور یوں پُرحکمت طریق سے اس فریضہ پر عمل کے لیے طبائع انسانیہ بتدریج تیار ہو گئیں۔

۵- تدریج اور تحریم خمر:

شراب سازی اور شراب نوشی کو عرب معاشرے میں ایک کلچر کی حیثیت حاصل تھی۔ اسے چنداں معیوب نہ سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے ایسے ماحول کا ربِ حکیم وکریم نے خاص لحاظ فرمایا اور انسانی طبیعتوں کے مطابق پہلے اس عمل سے ان میں بتدریج تنفر پیدا کیا اور پھر متعدد مرحلوں میں اسے حرام قرار دیا گیا۔

اوّلاً ﴿وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّ رِزْقًا حَسَنًا﴾(۴۶) میں بتایا گیا کہ انگور اور کھجور

میں رزق حسن کے ساتھ سکر بھی موجود ہے جو عقل انسانی کیلئے مضر ہے۔ رزق حسن میں تو کوئی قباحت نہ تھی مگر سکر کی موجودگی بجائے خود چونکا دینے والی بات تھی۔ چنانچہ سلیم الطبع افراد اس آیت کے نزول پر از خود محتاط ہو گئے۔

﴿یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ قُلْ فِیْهِمَآ اِثْمٌ كَبِیْرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا﴾ (۴۷) فرما کر تحریم خمر میں مزید پیش قدمی کی گئی۔ اسی کے بعد ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى﴾ (۴۸) کہہ کر شراب سے نفرت کو مؤکد کر دیا گیا۔ پھر اسے

﴿اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِی الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ وَیَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ﴾ (۴۹)

پھر آخر آیت میں ﴿فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ﴾ (تو کیا تم ان چیزوں سے باز رہو گے) کہہ کر نہایت حکمت سے انسانی نفسیات کو مخاطب کیا ہے کیونکہ اس ''تدریجی حرمت'' کے سبب کمزور سے کمزور طبع انسان بھی اسے ترک کر سکتا ہے۔ ''کیا تم اب بھی باز نہیں آؤ گے؟'' اسی کے جواب میں حضرت عمرؓ نے فرمایا: ''انتهینا یا رب''۔ (۵۰)

ظاہر ہے رب کریم کے اس کلمہ استفہام کا جواب بندہ کی جانب سے اطاعت وانقیاد کی صورت میں ہی ظاہر ہونا ہے اور یہی ''حکمت تدریج'' ہے۔ اس آیت کے نزول کے بعد امتناع شراب کے قانون کو معاشرے میں کامل طریقے سے نافذ کر دیا گیا۔

جس طرح شروع میں تحریم شراب میں آہستگی اور تدریج سے کام لینا الٰہی حکمت کا تقاضا تھا اسی طرح اب حرام کر دینے کے بعد اس کی ممانعت کے قانون کو پوری شدت کے ساتھ نافذ کرنا بھی حکمت ہی کا تقاضا تھا۔ اسی لئے رسول کریم ﷺ نے شراب کے بارے میں عذاب کی سخت وعیدیں بتلائیں۔ اس کی توضیح صاحب تفہیم یوں کرتے ہیں:

''شراب کی حرمت کے سلسلہ میں اس سے پہلے دو حکم آ چکے تھے جو سورۃ بقرہ آیت ۲۱۹ اور سورۂ نساء آیت ۴۳ میں گزر چکے ہیں۔ اب اس آخری حکم کے آنے سے پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خطبہ میں لوگوں کو متنبہ فرما دیا کہ اللہ تعالیٰ کو شراب سخت ناپسند ہے۔ بعید نہیں کہ اس کی قطعی حرمت کا حکم آ جائے لہٰذا جن جن لوگوں کے پاس شراب موجود ہو وہ اسے فروخت کر دیں۔ اس کے کچھ مدت بعد یہ آیت نازل ہوئی اور آپ نے اعلان کرایا کہ اب جن کے پاس شراب ہے وہ نہ اسے پی سکتے ہیں، نہ بیچ سکتے ہیں بلکہ وہ اسے ضائع کر دیں۔ چنانچہ اسی وقت مدینہ کی گلیوں میں شراب بہا دی گئی۔'' (۵۱)

اس طرح پر اہل عرب سے یہ عادت ''اصول تدریج'' کے تحت بسہولت چھڑوا دی گئی۔ بصورت دیگر معاشرہ میں فساد و بغاوت پھوٹ پڑنے کا اندیشہ پیدا ہو جاتا اور ایک انارکی کی فضا پیدا ہو جاتی اور ایسی فضا میں منافقین کو اپنی سازشوں کے جال بننے

کا مواقع میسر آ جاتے اس لیے اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کو نقصان سے بچانے کے لیے اس کی تحریم کا سفر تدریجاً طے کروایا۔ یہی باری تعالیٰ کی بندوں پر شفقت و محبت کا تقاضا تھا۔

حکمت تدریج:

حکمت، معنی و مفہوم:

رب حکیم و علیم کے ہاں سے احکام کے نزول میں انسانوں کے احوال اور وقائع اور ان کے مزاج کا لحاظ رکھا جاتا ہے اور ان کی خاص طریقہ پر تدریجاً تربیت کی جاتی ہے تا کہ وہ احکامِ شرعیہ کا تحمل کر سکیں اس امر کو'' حکمت'' کا عنوان دیا جاتا ہے کیونکہ حکمت بجائے خود انسانی شرف و عظمت کی امین ہے۔ اس میں ان امور کو بالخصوص ملحوظ رکھا جاتا ہے کہ کام کا انداز، وقت، موقع محل کا لحاظ، مزاج شناسی اور حصولِ مقاصد کے طریقہ وغیرہ۔ گویا حکمت علم کے ارفع درجہ کا نام ہے کہ جس کی بدولت نتائجِ علم ظاہر ہوتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ مَنۡ یُّؤۡتَ الۡحِکۡمَۃَ فَقَدۡ اُوۡتِیَ خَیۡرًا کَثِیۡرًا﴾ (۵۲)

حکمت کی تشریح کرتے ہوئے امام راغب کمال اختصار سے لکھتے ہیں:

" الحکم اصا بة الحق با لعلم و العقل "(۵۳)

مختصر یہ کہ علم کا ابلاغ اور کسی شے کا امر اس طرح سے دیا جائے کہ جس میں طبائع انسانیہ کا لحاظ کرتے ہوئے مطلوب نتائج حاصل ہو جائیں اور انسانوں کو اس عمل سے بُعد نہ رہے۔

تربیتِ امت:

معاشرہ کی تربیت کے بعد احکام شرعیہ کی تنفیذ سے مقصود یہ تھا کہ لوگوں میں تدریجاً مشقت و تکلیف برداشت کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ اسی حکمت کے سبب ابتدا میں عقائد و عبادات اور مکارم اخلاق سے متعلق احکام دیئے گئے تا کہ طبائع انسانی اس کا تحمل کر سکیں جس جس طرح تربیت ہوتی چلی جائے گی اس اس طرح افرادِ معاشرہ احکامِ اسلام کو قبول کرتے جائیں گے۔ تدریج کی دین میں اہمیت کے حوالے سے ڈاکٹر محمود احمد غازی اس طرح روشناس کرواتے ہیں۔

'' پانچویں چیز جو شریعت نے پیش نظر رکھی ہے وہ تدریج ہے۔ تدریج کے معنیٰ یہ ہیں کہ شریعت کے احکام پر آہستہ آہستہ، تھوڑا تھوڑا کر کے عمل کرایا جائے۔ اگر کوئی شخص دین سیکھنے کے لیے آپ کے پاس آیا ہے تو آج ہی سارے کا سارا دین اس پر نہ لاد دیں۔ اس کو تدریج کے ساتھ دین پر لائیں۔ پہلے بنیادی کلمات اس کو بتائیں، پھر جب وہ مزید قریب آ جائے اور اس کا ایمان مزید پختہ ہو جائے تو اس کے اخلاق پر توجہ دیں جب اخلاق درست ہو جائے تو ایک ایک کر کے سارے احکام اس کو بتائیں۔ اور پھر جتنا شوق اس کو پیدا ہوتا جائے گا اتنا ہی

جلدی وہ سارا دین سیکھ لے گا۔ یہ قرآن پاک کا طریقہ بھی ہے، رسول اللہ کا طریقہ بھی یہی تھا اور صحابہ کرام کا طریقہ بھی یہی تھا۔ تدریج اور لوگوں کو آہستہ آہستہ دین کے راستے پر لانا یہ اللہ کی شریعت کا بنیادی طریقہ کار اور اللہ کی سنت ہے۔'' (۵۴)

مولانا تقی امینی اتدریج کے اس عمل کو فطری انداز سے بیان کرتے ہوئے اسے ایک بچے کے نظام ہضم سے مماثل قرار دیتے ہوئے اس تدریج کو اس کی مرحلہ بہ مرحلہ ضروری قرار دیتے ہیں تا کہ اس کی قوت ہاضمہ مضبوط ہو کر احکام شرعیہ کا تحمل کر سکے آپ لکھتے ہیں:

''قرآنی احکام ۲۳ سال کی مدت میں حالات و تقاضا کے لحاظ سے نازل ہوئے ہیں۔ ابتدا میں مجمل احکام عقائد و عبادات سے متعلق تھے اور بعد میں مفصل احکام معاشرتی و تمدنی معاملات وغیرہ سے متعلق تھے۔ قومی اور جماعتی زندگی کی جیسی تربیت ہوتی گئی اور اس میں تحمل و برداشت کی جتنی صلاحیت بڑھتی گئی، اسی مناسبت سے غذا اور دوا کی تجویز ہوتی رہی۔ ابتدا میں بچہ کو صرف دودھ پر رکھا گیا۔ یہ دودھ ایک طرف غذا کا کام دیتا رہا اور دوسری طرف زیادہ ثقیل غذا ہضم کرنے کی صلاحیت پیدا کرتا رہا۔ درمیان میں وقتاً فوقتاً برداشت کے مطابق دوسری مقویات کا بھی استعمال کرایا جاتا رہا۔ یہاں تک کہ بچہ اس قابل بن گیا کہ وہ غذا کو ہضم کر سکے۔ پھر غذا کے دینے میں بھی اس کی طبیعت اور مزاج کی پوری رعایت ملحوظ رکھی گئی تھی۔ یعنی نہ ایک وقت میں ثقیل غذا دی گئی اور نہ انواع واقسام کی غذاؤں کو ایک ہی وقت میں دینے کی کوشش کی گئی۔ اس طرح مجموعی حیثیت سے اوامر و نواہی میں بتدریج ترقی کے مدارج طے کرائے گئے۔ حتیٰ کہ نماز روزہ وغیرہ نواہی میں جو انداز اختیار کیا گیا اور قوت ہضم کے معائنہ کے بعد جن مختلف مراحل سے گزارا گیا، عہد نبوت کی تاریخ کا طالب علم ان سے بخوبی واقف ہے۔'' (۵۵)

پھر مولانا موصوف اس تدریج کا فلسفہ بیان کرتے ہیں:

''مذکورہ طریقہ کار اور تدریجی ارتقاء قانون دنیا میں یہ ذہنیت پیدا کرنا چاہتا ہے کہ دنیا میں کوئی قانون اور کوئی نظام اوپر سے نہیں مسلط کیا جاتا بلکہ اندر سے ابھرتا اور ہر بُن مُو سے رس رس کر نکلتا ہے اور وہی قانون کامیاب ہوتا ہے جو انسان کی فطرت اور تربیت یافتہ رجحانات سے موافقت رکھتا ہے۔'' (۵۶)

گویا بیشتر اسلامی قوانین کے تدریجی ہونے کی علت ہی ان پر دائماً عمل کروانا ہے۔ اور یہ نتائج ایک خاص تربیتی نہج سے گزر کر ہی حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

اس معاملے میں حضرت عائشہؓ کا قول بنیادی رہنمائی کرتا ہے کہ انسان کی فطرت کے تقاضوں کے مطابق کس طرح احکام کا نزول ہوا اور ان کی خاص تربیت میں بھی بنیادی انسانی مصالح کا کس قدر خیال ولحاظ رکھا گیا ہے۔

"انما نزل اول ما نزل منه سورة من المفصل فيها ذكر الجنة والنار، حتى اذا اتاب الناس الى الاسلام نزل الحلال والحرام ولو نزل اول شئى: لا تشربو الخمر، لقالو لا تدع الخمر أبدا، ولو نزل لا تزنوا لقالوا لا تدع الزنا أبداً"(۵۷)

۱-امام ابن حجر عسقلانی اس کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حضرت عائشہؓ کے اس قول میں اس حکمت الٰہیہ کی طرف اشارہ ہے جو نزول قرآن کی ترتیب کے سلسلہ میں واقع ہوئی۔ پہلے پہل توحید کی طرف دعوت دی گئی۔ مومنوں و فرمانبرداروں کو جنت کی خوشخبری دی گئی، کافروں اور نافرمانوں کو دوزخ سے ڈرایا گیا۔ جب نفوس اس پر پختہ ہو گئے تو دیگر احکام نازل ہوئے''۔(۵۸)

مفسرین کرام کی توضیحات:

اس پہلو میں جب ہم آئمہ و مفسرین کی توضیحاتِ حکمت کو دیکھتے ہیں تو وہاں اس معاملے میں بڑی پُر حکمت اور جامع تفسیر ہمارے سامنے آتی ہے اور اس موضوع کے استحصاء سے معلوم ہوتا ہے کہ دینِ حنیف کی ترتیب کس قدر فطری اور پر حکمت ہے۔ اور یہاں تدریج اور انسانی مصلحتوں کو کس قدر ملحوظ رکھا گیا ہے اور جلیل القدر مفسرین اس تدریجی اور مصلحت کو کتنا وزن دیتے ہیں اور اس کی تفہیم اور تسہیل کو بالکل نظر انداز نہیں ہونے دیتے۔

امام رازیؒ لکھتے ہیں: ''اگر اللہ تعالیٰ مخلوق پر یکبارگی قرآن اتار دیتا تو ان پر یہ بات گراں گزرتی، پر جب نجماً نجماً نازل ہوا تو تکالیف و مشقتیں بھی کم ہوئیں اور برداشت کرنا بھی آسان ہو گیا اور شرائع و احکام لوگوں کے دلوں میں راسخ ہو گئے۔''(۵۹)

امام ابن کثیر، اس حکمت کو یوں کھولتے ہیں: 'ان کی طویل عبارت کے نمایاں نکات یہ ہیں:

i- مومنوں کا دل جمار ہے۔

ii- عمل میں مشکل نہ ہو۔

iii- ہر بات وضاحت سے سمجھ میں آ جائے۔

iv- ہر اعتراض کا جواب بھی ملتا رہے۔

v- عمل راسخ ہو جائے۔(۶۰)

امامِ قرطبی، کے نزدیک تدریج کا لحاظ نہ رکھنے سے دین ایک کھلواڑ بن جاتا ہے اور لوگ اسے نا قابلِ عمل سمجھنا شروع کر دیتے ہیں، آپ لکھتے ہیں:

"ولوا خذوا بجميع الفرائض فى وقت واحد لتنفروا"(۶۱)

''اور اس طرح دین کو ایک کھیل تماشا بنائے جانے کا امکان تھا، اسی لئے رب کریم نے اس کے لئے تدریج کا طریقہ اختیار فرمایا۔''

تفسیر نسفی، میں ہے:

"انزلناه نجما بعد نجم، أی أنزل آية آية، وسورة سورة علی حسب الحوادث"(۶۲)

''ہم نے اس قرآن کی سورہ وآیات کو بالتدریج حسب موقع نازل کیا'' تاکہ مرحلہ وار اُمت کی تربیت ہو اور توحش و نفرت کے بجائے دین روح وقلب میں اتر کر بصورت عمل ظاہر ہو کیونکہ یہی نسخہ اُمت کے مناسب حال تھا۔''

مناہل العرفان، میں ہے ''جوامت مسلمہ ابھر رہی تھی اسی کی علمی وعملی تربیت کیلئے تدریجی اصول ہی مناسب تھا اور باطل عقیدوں اور فاسد ورذیل عادتوں کو چھڑانے کی راہ ہموار کرنے کیلئے ایک بہترین نسخے کا کام اس تدریجی نزول سے ہو رہا تھا۔''(۶۳)

محمد علی صابونی اس حکمت کی تفصیل بیان کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ ااس کی حکمتیں کس قدر معنیٰ خیز ہیں اور احکام و عبادات دونوں میں اس ''تدریج'' کا نفوذ نظر آتا ہے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے ہر چیز میں انسانی عادتوں اور احوال کا لحاظ رکھا ہے:

''اس تدریج میں بڑی عظیم حکمت پوشیدہ تھی۔ قرآن کریم نے شرعی خصوصیات اور ماحول عرب کے مطابق ان لوگوں کو بعثت، جزا وسزا کے تصور کے ذریعے شرک ترک کرنے اور قلوب واذہان کو ایمان سے روشن کرنے اور نفوس میں اللہ ورسول ﷺ کی محبت داخل کرنے کی سعی فرمائی۔ پھر اگلے مرحلے میں ہجرت سے قبل عبادات پر آمادہ کیا۔ ہجرت کے دوسرے برس صدقۃ الفطر واجب ہوا اور چھٹے سال حج، اسی طرح موروثی عادات بدترک کرانے کے لئے بھی حکمت وتدریج سے کام لیا گیا۔''(۶۴)

جب حضورؐ تشریف لائے اور قرآن نازل ہوا تو اہل عرب میں جہاں بہت سی بدوی اور فطری خصوصیات موجود تھیں کچھ اچھے اخلاق کے ساتھ ساتھ کئی بری معاشرتی عادتوں میں بھی مبتلا تھے۔ ان کی بری عادتوں سے اللہ تعالیٰ نے انسانیت کو دور رکھنا چاہا تاکہ ان کی تربیت دھیرے دھیرے ہو، اس کے اندر سے رذائل نکلتے چلے جائیں اور پھر اخلاقِ عالیہ کی صفات ان میں راسخ کردی جائیں اور یہ عمل سوائے تدریج کی حکمتِ عملی کے ممکن ہی نہ تھا کیونکہ اللہ جل مجدہ نے انسان کو مدنی الطبع پیدا کیا ہے ااور اس میں بتدریج سیکھنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیت رکھ دی ہے چنانچہ ربِ کریم نے انسانِ اول حضرت آدمؑ کو اسی صلاحیت کا امین بنایا اور ﴿وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ ﴾(۶۵) بتقاضائے فطرتِ انسانیہ ''حکمت تدریج'' کا پہلو اختیار کرتے ہوئے آہستہ آہستہ احکام نازل کئے۔ اس طرح ''الاَ ھم فالاَ ھم'' کے اصول کے مطابق عقائد واخلاق اور اعمال کی تطہیر وتکمیل انتہائی پرحکمت طریقے سے تدریجاً مکمل ہوگئی۔

اب اس سیکھنے کے عمل میں جو بنیادی چیز ہے وہ انسانی فطرت کا لحاظ ہے۔ جو انسان کو بتدریج آگے یعنی مشکل کی طرف لے جاتی ہے۔ اس سے جملہ مشکلات از حد آسان ہو جاتی ہیں اور انسان کے سیکھنے کی صلاحیت میں حیرت انگیز پھیلاؤ، وسعت اور

تنوع آجاتا ہے۔اور اس کی صلاحیتوں کی جولان گاہ آفاق کی وسعتوں تک جا پہنچتی ہے اسی پر مداومت سے ترقی ملتی ہے۔اور شریعتِ اسلامیہ کے اصول تدریج کا حاصل بھی یہی ہے کہ انسان علم وعمل کی دنیا میں اور شریعت کے نفاذ کے میدان میں اس تدریج سے متمتع ہو۔اور اپنی مشکلات پر قابو پاتا چلا جائے اور دین کو اس کی حکمتوں اور لوازم کے ساتھ معاشرے کے اندر نافذ کر سکے۔

نئے مسائل میں رہنمائی:

نئے پیش آمدہ مسائل سے متعلق امت کی رہنمائی تدریجی نزول کے سبب ممکن ہوئی۔ جب کوئی جدید مسئلہ درپیش ہوتا تو اس کی مناسبت سے قرآن مجید کا ایک حصہ نازل ہو جاتا اور اللہ تعالیٰ اس مسئلہ کے متعلق وہ احکام بتا دیتے جو اس کے مطابق ہوتے۔ چونکہ ہر واقعہ اور معاملہ اپنے حادث ہونے کی بنا پر اپنے زمانے سے مخصوص ہے، اس بنا پر ظاہر ہے کہ ان امور کے فیصلوں کی بابت ہدایات بھی انہیں اوقات میں نازل ہونی چاہئے تھیں۔ جب وہ واقعات رونما ہوتے اور یہ اسی صورت میں ممکن تھا جب قرآن کا نزول تدریجی ہوتا۔

عبدالوہاب خلاف لکھتے ہیں کہ:

> ''اگر ایک ہی وقت میں احکام نازل ہو جاتے تو طبیعتوں میں قبولیت احکام شرعیہ کے لئے مطلوب پختگی حاصل نہ ہوتی۔ قانون کی صحیح معرفت اور پیش آئندہ اور نو پید مسائل میں صحیح رہنمائی، تدریجی نزول کی بدولت ممکن ہوئی اور یہی شریعت کا مقصود بھی ہے۔''(۶۶)

جب نئے مسائل میں شریعت رہنمائی کرے تو اس سے نفوس میں ایمان راسخ ہوتا ہے اور تہذیبِ نفوس کے ساتھ ساتھ تطہیر و تکمیل ایمان کا عمل جاری رہتا ہے اور آنے والے وقت میں اس کے نئے افادی پہلو واضح ہوتے چلے جاتے ہیں۔

عدمِ حرج اور رحمت کا پہلو:

رب تعالیٰ اپنے بندوں کے لئے بہت کریم و شفیق ہے۔ وہ رأفت و رحمت کو اپنے بندوں کے لئے پسند فرماتا ہے۔ سختی و خشونت اور اپنے احکام کو بندوں پر مسلط کرنا ڈھونسنا اس کی ''سنت'' کے خلاف ہے بلکہ وہ ذات علیم و خبیر بندوں کے رجحانات و عادات کا خیال کرتے ہوئے احکام کا نزول فرماتی ہے اور اکثر احکام کے نزول سے قبل مختلف پہلوؤں سے اس کے لئے ان کے ذہن اور سوچ کی مناسب زمین تیار کرتی اور پُر حکمت طریقے سے انہیں اس جانب مائل کرتی ہے۔ جب اذہان و قلوب اس تبدیلی کیلئے آمادہ ہو جاتے ہیں تو پھر رب کریم کی جانب سے احکام شرعیہ نازل ہوتے ہیں۔ بندوں کے ساتھ اس کا رویہ رحیم و شفیق ہونے کے سبب سے ہے۔ اس امر کا اظہار متعدد آیات سے ہوتا ہے۔(۶۷)

رب عزوجل نے بندوں کے متعلق عام طور پر ''رحمت'' کا رویہ اختیار فرما رکھا ہے۔(۶۸)

پھر رب کریم وعظیم نے حضور ﷺ کو بھی آپ رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

﴿وَ مَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ (۶۹)

یعنی حضور ﷺ کی بعثت کو رب تعالیٰ نے رحمت عامہ سے تعبیر کیا ہے۔اس لئے کہا گیا ہے کہ:

"فهذا اخبار منه جل و علاء بان ارسال الرسول ﷺ رحمة الناس و من الرحمة الاذن لهم على لسانه ﷺ جلب المصالح و دفع المفاسد عنهم مصالح تتجد و تتجد الأيام فلو وقف الاعتبار على النصوص فقط لوقع الناس فى الحرج الشديد وهو مناف للرحمة" (۷۰)

''یہ رب ذوالجلال کی جانب سے اس حقیقت کا اعلان ہے کہ رسول ﷺ کو رسول بنا کر بھیجنا لوگوں کیلئے رحمت ہے اور حضور ﷺ کی زبان مبارک پر جلب مصالح ودفع مفاسد کی اجازت دینا از قبیل رحمت ہے۔یہ مسلمہ امر ہے کہ مقصد (aim) کے بدلنے سے نئے نئے مفاسد پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ایسی حالت میں اگر صرف نصوص ہی کا اعتبار کیا گیا تو لوگ سخت قسم کے حرج میں مبتلا ہو جائیں گے تو اس طرح رحمت کے منافی بات لازم آئیگی۔''

حضور ﷺ رحمت کا ایک وصف یہ بھی بتلایا گیا ہے کہ آپ دنیا کو ناروا بوجھ اور زنجیروں سے آزادی دلوانے کیلئے آئے ہیں۔فرمایا! ﴿وَ يَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ﴾ (۷۱)

یہ زنجیریں کیا تھیں؟ مذہبی زندگی کی ناقابل تغیر وناقابل عمل پابندیاں، قانونی موشگافیاں، خودساختہ ''شرعی'' حدود وضوابط اور وہم پرستیوں کا انبار۔یہ وہ گراں بوجھ تھے کہ جن کے تلے انسانیت سسک رہی تھی۔مختصر یہ کہ مذہب کے مقدس نام پر ''فطرت سلیمہ'' کو کچلا جارہا تھا۔حضور ﷺ آپ رحمت نے آکر تعبد کی ان مصنوعی زنجیروں کو توڑا اور انسانیت کی تمام بندشوں ورکاوٹوں کو دور کر کے اسے سچائی کی آسان وسہل راہ دکھلا دی کیونکہ اسکی بدولت نفوسِ انسانی میں ہر دینی حکم کا تحمل آجاتا ہے۔اللہ تعالیٰ کی ''سنت تدریج'' اس ''آسان راہ'' پر عمل کرنے میں انسانیت کی مساعدت کرتی ہے۔اس ''تدریج'' کی بدولت انسانیت پر دین کے حوالے سے کوئی ایسا بوجھ نہیں پڑا کہ جس کو اٹھانے کی انسانیت میں سکت وہمت نہ ہو۔

اس اعتبار سے یہ تدریج اللہ تعالیٰ کی جانب سے بندوں کے لئے ایک انعام ورحمت ہے کہ انسانیت جیسے جیسے احکام شریعت کو نبھانے کی اپنے اندر صلاحیت پیدا کرتی جائے ایسے ایسے اس پر احکام شرعیہ کا بار ڈالا جائے۔

رحمت وشفقت کے اس پہلو کی وضاحت ارشادات نبوی ﷺ سے بھی ہوتی ہے:

"عن النبى ﷺ قال ان الدين يسر ولن يشاد الدين احد الا عليه فسدوا و قاربوا و ابشرو او استعينوا بالغدوة والروحة و شئى من الدلجة" (۷۲)

''فرمایا دین بہت آسان ہے اور جو شخص دین میں سختی کرے گا وہ دین اس شخص پر غالب آجائے گا۔پس تم لوگ میانہ روی کرو اور اعتدال سے قریب رہو اور خوش ہو جاؤ کہ تمہیں ایسا آسان دین ملا اور صبح اور دوپہر اور کچھ رات میں عبادت کرنے سے دینی قوت حاصل کرو۔''

آپؐ نے فرمایا: ''یسروا ولا تعسرو ابشرو ولا تنفروا ''(۷۳) ایک اور موقع پر ارشاد فرمایا: ''مجھے آسان دین حنیفی کے ساتھ بھیجا گیا ہے۔''(۷۴)

تدریج اللہ کے بندوں پر شفقت کا ایک انداز بھی ہے اور خود رسولِ کریم ﷺ بھی شفقت کے اس پہلو کو مدنظر رکھتے تھے۔ حضرت عائشہؓ آپ کے اس عمومی رویے کو یوں بیان فرماتی ہیں:

"اِنْ کان رسول اللّٰہ ﷺ لیدع العمل و ھو یحب ان یعمل بہ خشیۃ ان یعمل بہ الناس فیفرض علیھم"(۷۵)

انسانی مصلحتوں کا لحاظ:

مفہوم وتعریف:

احکام شریعت کا نفاذ چونکہ انسانوں پر ہوتا ہے اور رب کریم نے نزول احکام میں بھی انسانی مصالح اور عادات کا لحاظ فرمایا ہے اور انسان کو ''تکلیف مالایطاق'' کا پابند نہیں کیا اور اس کی کمزوریوں و مصلحتوں کو پیش نظر رکھا ہے۔ یہ مصلحتیں دراصل انسان شناسی کا مظہر ہیں اور شریعت مطہرہ میں اس کا خاص لحاظ رکھا جاتا ہے۔

علامہ عزالدین فرماتے ہیں:

" ان الشریعۃ کلھا مصالح اما و دفع مقاصد او جلب منافع " (۷۶)

گویا شریعت کا مزاج ہی محکم اصولوں کے ساتھ ساتھ انسانی مصالح کی رعایت پر مبنی ہے۔ امام غزالی اس تناظر میں مصلحت کی تعریف مقاصد شریعت کے حوالے سے بیان کی ہے:

" نعنی بالمصلحۃ المحافظۃ علی مقصود الشرع ، ومقصود الشرع من الخلق خمسۃ وھو ان یحفظ علیھم دینھم ونفسھم وعقلھم ونسلھم ومالھم فکل ما یتضمن حفظ ھذہ الاصول الخمسۃ فھو مفسدۃ ودفعھا مصلحۃ" (۷۷)

یعنی بنیادی طور پر یہ پانچ امور مقاصد شریعت میں شامل ہیں:

(الف) حفاظت دین (ب) حفاظت جان (ج) حفاظت عقل

(د) حفاظت نسل (ہ) حفاظت مال

علامہ شاطبی مصلحت کی توضیح کرتے ہوئے اس کی ترجیحات کا تعین کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ کس وقت اور کونسی مصلحت، کس درجہ میں مطلوب ہوتی ہے:

''دنیوی مفاسد یا مصالح میں غالب پہلو کو دیکھا جاتا ہے اگر کسی معاملے میں مصلحت کا پہلو غالب ہو تو اسے عرف میں مصلحت تصور کیا جاتا ہے اگر کسی پہلو میں نقصان کا پہلو غالب ہو تو اسے فساد یا مفسدہ تصور کیا جاتا ہے۔ اس

لیے جس معاملے میں دونوں پہلو موجود ہوں تو وہاں راجح اور غالب پہلو کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔ اگر مصلحت راجح ہو تو اسے مصلحت سے تعبیر کیا جاتا ہے اور وہ مطلوب ہوتی ہے۔ لیکن جہاں خرابی کا پہلو راجح ہو تو اسے فساد خرابی یا مفسدہ کہتے ہیں اور اس سے بچنے کی کوشش کی جاتی ہے۔'' (۷۸)

مصلحت کا تعلق امور دینی و دنیوی دونوں سے ہے اور ان میں درجات کا باہمی تفاوت بھی ہے یہاں دنیوی پہلو کی مصلحت زیر بحث ہے اگر چہ اس کے اثرات، حیات اخروی پر بھی مرتب ہوتے ہیں اور اس مصلحت کی وسعت و گہرائی دنیاوی امور کے بہت سے گوشوں کا احاطہ کرتی ہے۔ علامہ یوسف القرضاوی، مصلحت کی تشریح بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شریعت میں جس چیز کا حکم دیا جاتا ہے اس میں یا تو دنیا اور آخرت دونوں کا فائدہ ہوتا ہے یا پھر کسی ایک کا۔ اور جس چیز سے روکا جاتا ہے اس میں یا تو دین دنیا دونوں کا نقصان ہوتا ہے یا ان میں سے کسی ایک کا۔ جس عمل کے کرنے سے بہترین مصلحت کو حاصل کیا جائے وہ افضل الاعمال ہوتا ہے اور جو ان میں سے سب سے بدترین خرابی کا ذریعہ بنے تو وہ ارذل الاعمال ہوگا۔ چنانچہ دنیا میں کوئی سعادت نہیں ہے جو معرفت حق، ایمان اور اطاعت الٰہی سے زیادہ صالح ہو اور کوئی شقاوت نہیں ہے جو جہالت، کفر اور فسوق و عصیان سے زیادہ بری ہو۔'' (۷۹)

مکاتب فقہا میں بالخصوص، فقہ مالکی میں اس مصلحت کا استعمال بہت وسیع اور عام ہے اور وہ مصلحت کو رواج پذیر مصلحتوں تک متعدی کرتے ہیں ان کے ہاں اس کی خاص اصطلاح '' مصالح مرسلہ'' ہے۔ ڈاکٹر محمود احمد غازی مالکیہ کی اس اصطلاح سے یوں متعارف کرواتے ہیں:

''مصلحت مرسلہ یا مصالح مرسلہ سے مراد وہ مفید اور فائدہ مند چیز (منفعت) ہے جس کے بارے میں شریعت خاموش ہو، نہ شریعت نے اس کو صراحت سے تسلیم کیا ہو اور نہ صراحت سے اس کو لغو اور غلط قرار دے کر اس کی ممانعت کی ہو۔ یہ دو شرطیں اس لیے ضروری ہیں کہ ہر شخص کے سامنے یہ واضح رہے کہ مصلحت کے اصول سے صرف اسی وقت کام لیا جائے گا جہاں فقہ کے اولین ماخذ (قرآن، سنت، اجماع اور اجتہاد) خاموش ہوں۔ مزید برآں جس چیز کو شریعت صراحۃً تسلیم کرتی ہو تو وہ پہلے ہی حکم شرعی ہے اور اس پر عمل درآمد براہ راست قرآن مجید یا سنت رسولؐ کی سند کی بنیاد پر کیا فانا ضروری ہوگا۔ اس طرح جس چیز کو شریعت نے مصلحت تسلیم کرنے سے پہلے ہی انکار کر دیا ہو اس کو مصلحت سمجھنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہٰذا مرسلہ کی شرط انتہائی مناسب اور موزوں ہے۔'' (۸۰)

مختصر یہ کہ مصالح انسانیہ کا شریعت مطہرہ قدم قدم پر لحاظ رکھتی ہے، اسی بنا پر فقہاء عظام نے آیات و احادیث سے

استنباط کرتے ہوئے، مصلحت اور اسکی حدود و قیود متعین کی ہیں اور اس کی حکمتوں پر روشنی ڈالی ہے کہیں یہ مصلحتیں، مصالح مرسلہ تک وسعت پذیر ہوگئی ہیں اور کہیں ''عرف'' کے عنوان سے سوسائٹی کے نو بہ نو مسائل کو حل کرتی دکھائی دیتی ہیں اور اسلام کے ذہنی نفوذ سے عملی نفاذ تک مدد و معاون بنی ہوئی ہیں۔

خلاصہ:

اوپر مذکور آیات و احادیث نبوی ﷺ اور صحابہ کے اقوال کے ساتھ اسلامی تاریخ کے نظائر سے معلوم ہوا کہ نفاذ دین میں ''تدریج'' کی حکمت عملی کیوں کر اختیار کی گئی۔ اس سے مقصود یہ تھا کہ ان پر ایسے احکام و قوانین نہ ٹھونسے جائیں کہ جن کے لوگ عادی نہ ہوں کیونکہ تدریجی رویہ اپنائے بغیر نفاذ دین حقیقتاً دین میں فتنے کا دروازہ کھول دیتا ہے۔ لوگوں کی دین سے محبت نفرت میں اور قربت بعد میں بدل جانے کا شدید خدشہ ہوتا ہے اور تدریج کی حکمت کے سبب دین محض وظیفہ لسان بننے کی بجائے روح و قلب کے اندر اتر کر پورے جسم کو سرتاپا آمادۂ عمل کر دیتا ہے اور یہی دین کا مقصود ہے۔

نزول احکام میں تدریج کا حاصل، توازن، اعتدال، میانہ روی اور فطرت سے ہم آہنگی ہے۔ اس ''توازن'' سے اخلاقی و روحانی تطہیر ہوتی ہے اور یوں انسان تدریجاً احکام شرعیہ کی بدولت قربِ الٰہی کی منازل طے کرتا ہے اور اس کے معاشرتی و سیاسی نتائج بھی ظاہر ہوتے ہیں اور انسانی نفسیات، اطاعت و انقیاد کی، ''مسلم نفسیات'' میں ڈھل جاتی ہیں اور یہی امر ''اصول تدریج'' کا خاصہ و لازمہ ہے

تدریج کا یہ اصول ہماری رہنمائی کرتا ہے کہ ''نفاذِ شریعت'' کا کام بابرکت ہونے کے ساتھ ساتھ کتنی نزاکتیں اور حکمتیں اپنے اندر پوشیدہ رکھتا ہے۔ ایسی حکمتیں جن کا لحاظ نزول احکام میں خود خالق نے اور تنفیذ احکام شریعہ رسول مکرم ﷺ نے فرمایا ہے اور اب اِن حِکَم و مصالح کو نظر انداز کر کے محض جوش اور نعروں پر اکتفا کرنا اور نفاذِ شریعت کے تقاضے سمجھے بغیر اسے بے تربیت ذہنوں کی بانجھ مٹی پر اگانے کی کوششوں کا کیا نتیجہ نکل سکتا ہے اور اگر اس کے لوازم و حکمتوں کو ملحوظ رکھا جائے تو نفاذِ شریعت کی کیا کیا برکات میسر آ سکتی ہیں۔

اسی طرح ''انسانی مصالح'' کا لحاظ اور خیال نفاذ شریعت کا بنیادی اصول ہے اور نزول احکام میں اس کو ملحوظ رکھا گیا ہے اس لیے اسے نظر انداز کر کے مقاصد شریعت کا حصول، کامل طریقے پر حاصل نہیں ہو سکتا اور انسانی مصلحتوں، ان کے عرف و مزاج اور رواج پذیر مصلحتوں کا لحاظ کیے بغیر کسی سطح پر نفاذ شریعت کے عمل سے اس کی برکات پوری طرح سے حاصل نہیں ہو سکتیں۔ تدریج اور مصلحتوں کو مدنظر رکھنے سے ہی شریعت کے فوائد و ثمرات عامۃ الناس کو میسر آ سکتے ہیں۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ ھود:۱۱، آیت:۷۔

۲۔ القیامہ:۷۵، آیت:۱۷۔

۳۔ المؤمنون:۲۳، آیت: ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵۔ یہی مضمون مختلف پہلوؤں سے آیات ذیل میں بھی بیان کیا گیا ہے۔ الاعراف:۷، آیت:۵۴، یونس:۱۰، آیت۳، الفرقان:۲۵، آیت:۵۹، السجدہ:۳۲، آیت:۴، ق:۵۰، آیت:۳۸، الحدید:۵۷، آیت:۴۔

۴۔ الحج:۲۲، آیت:۵، (ترجمہ: لوگو! اگر تم کو (مرنے کے بعد) جی اٹھنے میں کوئی شک ہو تو ہم نے تم کو پہلی بار بھی تو پیدا کیا تھا مٹی سے۔ پھر اس سے نطفہ بنا کر، پھر اس سے خون کا لوتھڑا بنا کر، پھر اس سے بوٹی بنا کر جس کی بناوٹ کامل بھی ہوتی ہے اور ناقص بھی تا کہ تم پر اپنی (خالقیت) ظاہر کر دیں اور ہم جس کو چاہتے ہیں ایک میعاد مقررہ تک رحم مادر میں ٹھہرائے رکھتے ہیں پھر تم کو بچہ بنا کر نکالتے ہیں۔ پھر تم جوانی کو پہنچتے ہو اور بعض (جوانی سے پہلے ہی) مر جاتے ہیں اور بعض بڑھاپے کی نہایت خراب عمر کی طرف لوٹائے جاتے ہیں کہ بہت کچھ جاننے کے بعد بالکل بے علم ہو جاتے ہیں۔)

۵۔ المومن:۴۰، آیت:۶۷

۶۔ فقہ اسلامی میں تدریج اور اس کے مقتضیات کی تفہیم کے لیے جوہری فرق۔ کے باوجود مماثل اصطلاحات بھی استعمال کی گئی ہیں۔ متعلقہ ابحاث کے لیے دیکھیے:

(الف) شاطبی، ابواسحٰق بن ابراہیم، الموافقات فی اصول الشریعہ، مکتبہ المعارف بیروت، ۱۳۲۰۔

(ب) عزالدین بن عبدالسلام، قواعد الاحکام فی مصالح الانام، داراحیاء التراث العربی ۱۴۰۳۔

(ج) الآمدی، علی بن الجاعلی، الاحکام فی اصول الاحکام، مکتبۃ المعارف، بیروت ۱۳۱۲۔

(د) زرقا، مصطفیٰ احمد، الفقہ الاسلامی فی ثوبۃ الجدید، جامعہ دمشق، سوریہ ۱۳۲۵۔

(ہ) وہبہ الزحیلی، ڈاکٹر، اصول الفقہ الاسلامی، دارالفکر دمشق، ۱۹۹۷۔

۷۔ الیسوعی، لوئیس معلوف، المنجد، المطبعۃ، الغاثولیکہ، بیروت ۱۹۲۷، ص:۲۰۷، مادہ د۔ر۔ج۔

۸۔ ابن منظور الافریقی، لسان العرب، دارالفکر، بیروت، ۱۹۸۵، مادہ درج، ج:۲، ص:۲۶۸۔

۹۔ راغب اصفہانی، امام، مفردات، داراحیاء التراث العربی بیروت ۱۴۰۳، ج:۱، ص:۷۹۔۱

۱۰۔ زیات، احمد حسن، حامد عبدالقادر، محمد علی النجار، ابراہیم مصطفیٰ، المعجم الوسیط، مجمع اللغۃ العربیہ قاہرہ مصر ۱۹۸۰، مادہ درج، ج:۱، ص:۲۸۸

۱۱۔ تفصیل کے لیے دیکھیے حاشیہ ۷، نیز

(الف) غزالی حجۃ الاسلام، المستصفیٰ من علم الاصول، مطبع مصطفیٰ محمد قاہرہ مصر ۱۳۰۶۔

(ب) حسان حسین حامد، نظریۃ المصلحۃ فی الفقہ الاسلامی، مکتبۃ الحموی، قاہرہ، مصر ۱۳۰۶۔

(ج) صبحی المحمصانی، فلسفۃ التشریع فی الاسلام (اردو ترجمہ، مولوی محمد احمد رضوی) مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۸۵۔

(د) الزرقانی، محمد عظیم، مناہل العرفان فی علوم القرآن دار صادر، بیروت، ج:۱،ص:۲۰۔

۱۲۔ الفرقان:۲۵، آیت:۳۲۔ ۱۳۔ المائدہ:۵، آیت:۳

۱۴۔ نماز اور اس کے فلسفے کی تفصیل کیلئے ملاحظہ فرمائیں: سید سلیمان ندوی سیرۃ النبی ﷺ، ادارہ اسلامیات لاہور ۲۰۰۵، ج:۵،ص:۳۹، :۵۶۔

۱۵۔ صدیقی، یٰسین مظہر محمد، ڈاکٹر، مکی عہد نبوی میں اسلامی احکام کا ارتقاء، نشریات، اردو بازار، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص:۶۸۔

۱۶۔ بخاری محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح، مصطفیٰ البابی الحلبی، مصر ۱۳۹۰، کتاب الصلوٰۃ، باب کیف فرضت الصلوٰۃ فی الاسراء۔

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ نے جب نماز فرض کی تو سفر و حضر میں دو دو رکعتیں تھیں۔ پھر سفر کی نماز تو اپنی اصلی حالت میں رکھی گئی اور حضر کی نماز میں اضافہ کر دیا گیا۔''

۱۷۔ بخاری، الجامع الصحیح، کتاب العمل فی الصلوٰۃ، باب ما ینھیٰ من الکلام فی الصلوٰۃ۔

ترجمہ: ''ابن مسعودؓ فرماتے ہیں ہم حالت نماز میں حضورؐ کو سلام کرتے اور آپؐ جواب دیتے۔ جب ہم حبشہ سے واپس آئے اور حضورؐ کو حالت نماز میں سلام کیا تو آپ نے جواب نہ دیا۔ پوچھنے پر فرمایا نماز میں کلام کی ممانعت ہے''

۱۸۔ ترمذی، ابوموسیٰ محمد بن عیسیٰ، سنن ترمذی، مکتبہ امیریہ، مصر، ۱۳۹۳ھ، ابواب الصلوٰۃ، باب ۱۷۰،

۱۹۔ ابوداؤد، سلیمان بن اشعث سجستانی، سنن ابی داؤد، مطبوعہ قاہرہ، ج:۱،ص:۱۳۳۔

۲۰۔ ملا علی قاری، مرقاۃ، مکتبہ امدادیہ ملتان، ج:۱،ص:۵۱۔ ۲۱۔ مکی عہد نبوی میں اسلامی احکام کا ارتقاء، ص:۸۵۔

۲۲۔ شفیع، مفتی محمد، معارف القرآن، ادارۃ المعارف، کراچی، ۲۰۰۶ء، ج:۱،ص:۴۴۳۔

۲۳۔ ابن کثیر، عماد الدین، حافظ، تفسیر القرآن العظیم،، ادارہ اندلس بیروت ۱۳۸۵ھا (البقرہ:۱۸۳) ج۔۱۔ص ۲۷۲۔

۲۴۔ مسلم بن حجاج، الجامع الصحیح، کتاب الصوم، باب یوم عاشورہ، و مطبع محمد علی، مصر ۱۹۶۰۔

(عبداللہ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ جب حضور ﷺ مدینہ تشریف لائے تو یہودیوں کو یوم عاشورہ میں روزہ دار پایا۔ سو ان سے حضورؐ نے اس دن میں روزہ رکھنے کی وجہ دریافت فرمائی تو انہوں نے کہا کہ یہ دن ہمارے لئے بڑا متبرک و عظیم ہے کہ اسی دن اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ اور ان کی قوم کو نجات دی اور فرعون اور اس کی قوم کو غرق کیا تو حضرت موسیٰ نے بطور شکر روزہ رکھا۔ اس لئے ہم بھی (اس دن) روزہ رکھتے ہیں۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا ہم تمہاری نسبت موسیٰ کے زیادہ قریب و زیادہ حق دار ہیں۔ پھر حضور نے خود بھی روزہ رکھا اور مسلمانوں کو (اس دن) روزے کا حکم دیا۔)

۲۵۔ احمد بن حنبل، امام، المسند، مؤسسہ قرطبہ، ۱۹۵۲، روایت معاذ بن جبل، ج:۱،ص:۲۱۱۔

۲۶۔ البقرہ:۲، آیت:۱۸۱۔ ۲۷۔ مسلم، الجامع الصحیح، کتاب الصوم، باب یوم عاشورہ۔

۲۸۔ البقرہ:۲، آیت:۱۸۴۔ ۲۹۔ مکی عہد نبویؐ میں اسلامی احکام کا ارتقاء، ص:۱۵۶۔

۳۰۔ آل عمران:۳، آیت:۹۲۔ ۳۱۔ الحدید:۵۷، آیت:۱۰۔

۳۲۔ البقرہ:۲، آیت:۲۱۹۔ ۳۳۔ بخاری، الجامع الصحیح، کتاب الزکوۃ، باب الصدقۃ فیما استطاع۔

۳۴۔ حوالہ سابق۔ ۳۵۔ مسند احمد، ج:۱، ص:۲۰۲،

۳۶۔ بالعموم زکوۃ کو اصطلاحی معنوں میں مراد لے کر اس کی فرضیت ۲ھ کی لکھی جاتی ہے جب کہ زکوۃ ۸ھ میں فرض ہوئی۔ اس سے قبل یہ لفظ انفاق وصدقات کا ہم معنی تھا۔ مزید تفصیل کیلئے دیکھئے: ندوی، سید سلیمان، سیرۃ النبیؐ، ادارہ اسلامیات لاہور، ۱۹۸۱ء، ج:۵، ص:۱۴۸تا۱۵۴۔

۳۷۔ اس مبحث میں علمائے اسلام کے دو گروہ ہیں۔ ایک کا مؤقف حاشیۂ بالا میں ذکر کر آئے ہیں جبکہ دوسرے گروہ کے نزدیک زکوۃ مکہ مکرمہ ہی میں فرض ہوگئی تھی البتہ اس کی تفصیلات وغیرہ کی تعیین مدینہ منورہ میں ہوئی۔ تفصیل کیلئے دیکھئے: مکی عہد نبوی میں اسلامی احکام کا ارتقاء، ص:۱۱۳تا۱۳۵۔ ۳۸۔ بخاری، الجامع الصحیح، کتاب الزکوۃ، باب وجوب الزکوۃ۔

۳۹۔ شبلی، علامہ نعمانی، سیرۃ النبیؐ، ادارہ اسلامیات لاہور، ۲۰۰۴، ج:۲، ص:۴۴۰۔

۴۰۔ التوبہ:۹، آیت:۳۴۔ ۴۱۔ البقرہ:۲، آیت:۲۱۹۔

۴۲۔ التوبہ:۹، آیت:۱۰۳۔ ۴۳۔ بخاری، الجامع الصحیح، کتاب الزکوۃ، باب وجوب الزکوۃ۔
(تحصیل زکوۃ کیلئے آپ ﷺ نے مختلف اطراف میں عاملین کو مقرر فرمایا۔ اس سلسلہ میں معاذ بن جبل کا واقعہ مشہور ہے۔ آپ نے فرمایا: ''اذهبها الى شهادة ان لا اله الا الله وانى رسول الله فان اطاعوا لذالك فاعلمهم ان الله افترض عليهم خمس صلوات فى كل يوم و ليلة فان هم اطاعوا لذالك فاعلمهم ان الله افترض عليهم صدقة فى اموالهم يوخذ من اغنيائهم و ترد على فقرائهم)۔

۴۴۔ الماعون:۱۰۳، آیت:۳۔ ۴۵۔ التوبہ:۹، آیت:۱۳۴۔

۴۶۔ النحل:۱۶، آیت:۶۷۔ ۴۷۔ البقرہ:۲، آیت:۲۱۹۔

۴۸۔ النساء:۴، آیت:۴۳۔ ۴۹۔ المائدہ:۵، آیت:۹۱۔

۵۰۔ ابوداؤد، سنن، کتاب الاشربہ، باب تحریم الخمر کے اس موضوع کی اکثر روایات کو امام ابن کثیر نے یکجا کر دیا ہے۔ ان کو دیکھ کر ''حکمت و تدریج'' اور مفاسد خمر کا اچھی طرح علم ہو جاتا ہے۔

۵۱۔ مودودی، ابوالاعلیٰ سید، تفہیم القرآن، ادارہ ترجمان القرآن لاہور ۱۹۹۶، ج:۱، ص:۵۰۱۔

۵۲۔ البقرہ۲: آیت:۲۶۹۔ ۵۳۔ مفردات ج:۱، ص:۲۷۹۔

۵۴۔ غازی محمود احمد، ڈاکٹر، محاضرات فقہ، الفیصل ناشران کتب لاہور ۲۰۰۵، ص:۳۲۴۔

۵۵۔ تقی امینی محمد مولانا، فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر، قدیمی کتب خانہ، کراچی، ۱۹۹۱ء، ص:۷۳۔

۵۶۔ حوالہ سابق۔ ۵۷۔ بخاری، الجامع الصحیح، کتاب فضائل قرآن، باب تالیف القرآن۔
(پہلے پہل قرآن کی مفصل سورتیں (سورۃ ق تا الناس) نازل ہوئیں۔ ان میں جنت و دوزخ کا ذکر ہے۔ پھر جب اسلام لوگوں کے دلوں میں راسخ ہو گیا تو (احکام) حلال وحرام نازل ہوئے۔ اگر ابتدا ہی میں شراب کی حرمت کا حکم نازل کر دیا جاتا تو لوگ یہ کہتے کہ ہم شراب نہیں چھوڑ سکتے اور اگر ابتدا ہی میں زنا ترک کرنے کا حکم دے دیا جاتا تو لوگ کہتے کہ ہم اس سے باز نہیں آ سکتے۔)

۵۸۔ عسقلانی، ابن حجر، شہاب الدین، فتح الباری، مطبوعہ مصر ۱۹۵۹ء، ج:۱۰، ص:۴۱۵۔

۵۹۔ رازی، فخر الدین، امام، مفاتیح الغیب، مطبوعہ تہران، ج:۲۳، ص:۷۹، ۷۸۔

۶۰۔ تفصیل کے لئے دیکھئے: تفسیر ابن کثیر، ج:۴، ص:۱۱۔

۶۱۔ قرطبی، محمد بن احمد مالکی، الجامع الاحکام القرآن، دار الاحیاء التراث العربی، بیروت ۱۹۶۶ء، ج:۵، ص:۱۴۰۔
(اگر تمام فرائض دینیہ کو ایک ساتھ نافذ کر دیا جاتا تو لوگ (اس دین سے) دور بھاگ جاتے۔)

۶۲۔ نسفی عبداللہ بن احمد بن محمود، مدارک التنزیل وحقائق التاویل، مکتبہ السعادت، ۱۳۲۶ھ، ج:۳، ص:۱۰۷۔

۶۳۔ زرقانی، عبدالعظیم، مناہل العرفان، ص:۲۱۵۔

۶۴۔ الصابونی، محمد علی، التبیان فی علوم القرآن، دار المعارف، مصر، ص:۳۵۔

۶۵۔ البقرہ ۲:۳۱۔ ۶۶۔ خلاف، عبدالوہاب، خلاصہ التاریخ التشریع الاسلامی، مطبوعہ بحرین، ص:۱۹۔

۶۷۔ (۱) ﴿يُرِيدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾ سورۃ البقرہ ۲:۱۸۵
(۲) ﴿مَا يُرِيدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِنْ حَرَجٍ وَلٰكِنْ يُرِيدُ لِيُطَهِّرَكُمْ﴾ (المائدہ:۶)
(۳) ﴿وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ﴾ (الحج ۲۲:۷۸)
(٤) ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا﴾ (البقرہ ۲:۱۲۸)

۶۸۔ (الف) ﴿رَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ﴾ (الاعراف ۷:۱۵۶)
(ب) ﴿كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ﴾ (الانعام ۶:۱۲)
(ج) ﴿رَبُّكُمْ ذُو رَحْمَةٍ وَاسِعَةٍ﴾ (الانعام ۷:۱۴۷)

۶۹۔ الانبیاء:۲۱:۱۰۷۔ ۷۰۔ تعلیل الاحکام، ص:۲۸۷، بحوالہ احکام شرعیہ میں حالات وزمانہ کی رعایت، ص:۱۵۵۔

۷۱۔ الاعراف:۷:۱۵۷۔ ۷۲۔ بخاری، الجامع الصحیح، کتاب الایمان، باب الدین یسرہ۔

۷۳۔ بخاری، الجامع الصحیح، کتاب العلم، باب: ما کان الی یتخولھم باعظوعظۃ الحسنہ۔

۷۴۔ بخاری، الجامع الصحیح، کتاب الجہاد والسیر، باب ما یکرہ من التنازع والاختلاف فی الحرب۔

۷۵۔ بخاری، الجامع الصحیح، کتاب الصلوۃ، باب تحریض النبی علی صلوۃ اللیل والنوافل۔

۷۶۔ عزالدین ابن السلام، قواعد الاحکام فی مصالح الانام، ج:۱، ص:۱۹۔

۷۷۔ الغزالی، ابوحامد بن محمد، المستصفی من علم الاصول، مطبوعہ مدینہ منورہ، ج:۱، ص:۲۸۵۔

۷۸۔ شاطبی، علامہ، الموافقات، کتاب المقاصد، ج:۲، ص:۷۲۔

۷۹۔ القرضاوی، یوسف، علامہ، دین میں ترجیحات، (مترجم اردو، گل زادہ شیر پاؤ) منشورات، لاہور ۲۰۰۸، ص:۵۳۔

۸۰۔ محاضرات فقہ، ص:۱۰۷